سید شیراز زیدی
ریسرچ سکالر، جامعہ کراچی، کراچی

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ ادب اردو: تحقیق و تجزیہ

Syed Sheraz Zaidi

Research Scholar, University of Karachi, Karachi

Tabbassum kashmiree's "History of Urdu literature": A Research

Tabbassum kashmiree's "History of Urdu literature, till 1857"was published in 2003. A study of this book revealed that it was not written with a proper planning. Specially, its structure has so many faults. Kashmiree did not take pain for new research of literary facts, and new information of this field also. Although he claims to see the Urdu literature with his own vision but actually he does not give any thing new. So it is right to say that this book is not a fine addition in this field and kashmiree could not make a reasonable place among the writers of the history of Urdu literature.

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ 'ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک' سنہ ۲۰۰۳ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔ وہ اس سے قبل ''آبِ حیات'' اور رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادبِ اردو'' کو حواشی و تعلیقات اور مقدمے کے ساتھ مرتب کر چکے ہیں۔ انھوں نے اصولِ تحقیق پر ''ادبی تحقیق'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ جدید اردو ادب پر ان کی کتابیں، جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، نئے شعری تجزیے، شعریاتِ اقبال، لا=راشد، اور اس کے علاوہ ''فسانہ آزاد ایک تجزیہ'' شائع ہو چکی ہیں۔ اس سے ان کی تحقیقی کاوشوں، تنقیدی بصیرت اور جدید اردو ادب سے وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کاشمیری ۱۹۸۱ء میں اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز، جاپان میں اردو زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ وہیں اس تاریخ ادب کی داغ بیل پڑی۔ ڈاکٹر کاشمیری نے کلماتِ تشکر کے ذیل میں اس تاریخ ادب کی تصنیف کا جو محرک بیان کیا ہے وہ اس ادبی تاریخ کی حیثیت متعین کرنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ۱۸۹۴ء میں گریجویٹ کلاس کے جاپانی طلبا نے ان سے افسانے اور شاعری کی بجائے اردو ادب کی تاریخ پڑھانے کی

خواہش ظاہر کی تھی۔ یقیناً انھی طلبا کو پڑھانے کے لیے تبسم کاشمیری نے نوٹس تیار کرنے کے لیے کچھ مواد جمع کیا ہوگا۔ جیسا کہ انھوں نے خود رقم کیا ہے کہ :

''ان لیکچر کی تیاری کے لیے مجھے بے شمار مواد دیکھنا پڑا، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور فکری تواریخ کو کھنگالنا پڑا۔ اس دوران میرے پاس کثیر مقدار میں یہ مسالا جمع ہو گیا۔ چناں چہ ۱۹۹۶ء کے لگ بھگ میں نے اردو ادب کی موجودہ تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا خاکہ تیار کیا اور کام شروع کر دیا۔'' [۱]

پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک لکھی گئی اہم ادبی تواریخ پر ان کی نظر رہی۔ رام بابو سکسینہ، عبدالقادر سروری، احتشام حسین، محمد حسن، محمد صادق، جمیل جالبی، گیان چند اور سیدہ جعفر کی تاریخ نگاری کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان تواریخ میں ان تاریخ نگاروں کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے، یعنی ادبی تاریخ کا خام مواد موجود رہتا ہے مگر اس مواد سے جو تاریخ سامنے آتی ہے، وہ مورخ کی تاریخی بصیرت سے برآمد ہوتی ہے۔ مثلاً عبدالقادر سروری نے اپنی تاریخ میں ادب کو سیاسی، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں دیکھا ہے، سیدہ جعفر اور گیان چند نے تمام زور ادبی حقائق پر صرف کیا ہے، احتشام حسین نے مارکسی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ تبسم کاشمیری کا موقف ہے کہ ادبی مورخ کے پاس تاریخی واقعات و حقائق ایسے موجود ہوتے ہیں جیسے مچھلی فروش کے تختے پر مچھلی، ادبی مورخ تاریخ کے تختے سے ان حقائق کی طباخی کر کے اپنی مرضی سے پیش کرتا ہے۔ [۲] وہ اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

''ادبی مورخ کا کام صرف واقعات و حقائق تک محدود نہیں ہے۔ وہ واقعات اور حقائق سے آگے بڑھ کر ایک اور اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ واقعات و حقائق اور تاریخ کے مطالعے سے وہ ادبی تاریخ کے کسی دور، رجحان، نظریے یا کسی شخصیت کے بارے میں ایک وژن (vision) مہیا کرتا ہے۔ ادب کی تاریخ کو جو قوت ادبی تاریخ بناتی ہے، وہ ادبی مورخ کا وژن ہے۔'' [۳]

اب جہاں تک وژن اور تاریخی بصیرت کا تعلق ہے تو کاشمیری نے اپنی اس تاریخ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ

''جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ ہم اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل فلسفہ اور نفسیات کی روشنی میں اس دور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔ اس مطالعے میں بنیادی اہمیت تو ادب ہی کو حاصل رہے گی مگر ادب پر اثر انداز ہونے والے دیگر عوامل اور محرکات کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ کریں گے۔'' [۴]

اس پیش لفظ اور کلماتِ تشکر کے مطالعے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں

i۔ اس تاریخ کے مرتب کرنے کا محرک طلبا کے لیے تیار کیے جانے والے لیکچر بنے۔

ii۔ دبے دبے لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ادبی حقائق کی جانچ پڑتال کے چکر میں پڑنے کی بجائے مواد کا تجزیہ کر کے اپنے وژن سے تاریخ کو دیکھا جائے گا۔

iii۔ تجزیوں میں ادوار کے سماجی و اقتصادی علوم، دیومالا، سیاسی تاریخ تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات سے مدد

لی جائے گی۔

اس ادبی تاریخ کے جائزے سے پہلے مصنف کا نقطہ نظر واضح ہونا ضروری تھا بالخصوص اس وقت جبکہ زیرِ مطالعہ کتاب سے پہلے بہت سی مستند تواریخ لکھی جا چکی ہیں یہ جاننا بہت اہم تھا کہ آخر وہ کون سے وجوہات تھیں جن کی بنا پر مصنف نے ایک نئی ادبی تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ کاشمیری کا نقطہ نظر واضح ہونے کے بعد یہ آسان ہو گیا ہے کہ دیگر تواریخ کی موجودگی میں اس ادبی تاریخ کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے اور اس کے ساتھ یہ بھی جانچا جا سکے کہ مصنف اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس تحریر میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں۔ جب مصنف کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے ذہن میں اس کا خاکہ ترتیب دیتا ہے۔ وہ اس خاکے کے مطابق مواد کو کتاب کی صورت میں ڈھالتا ہے۔ خاکے کی یہی منصوبہ بندی کتاب کی ساخت اور ہیئت کا تعین کرتی ہے۔ تبسم کاشمیری نے 'کلماتِ تشکر' کے ذیل میں کہا ہے کہ ۱۹۹۶ء میں جب انھوں نے تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس سے پہلے ان کے پاس کافی مواد جمع ہو چکا تھا اور وہ طلبأ کے لیے لیکچر بھی تیار کر چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے خاکہ تیار کر کے کام شروع کیا اور پانچ سال اس میں صرف کیے۔[۱۵] اب دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے تاریخِ ادب کا کیا خاکہ تیار کیا اور اس کی ترتیب و تشکیل میں کس بصیرت کا ثبوت دیا۔ اس کے لیے ہم کتاب کے ابواب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کتاب کو جس کی ضخامت ۸۷۲ صفحات ہے فہرستِ ابواب کے مطابق ۱۱۹ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ متنِ کتاب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست میں دیے گئے کئی ابواب کے عنوانوں اور متن میں دیے گئے عنوانوں میں لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جن ابواب کے عناوین متن میں فہرست سے مختلف ہیں وہ یہ ہیں:

فہرست میں ابواب کے عنوان	متنِ کتاب میں ابواب کے عنوان

باب نمبر۱ کوئی عنوان نہیں دیا	زبان کا ابتدائیہ۔ پنجاب اور زبان کے ابتدائی نقش کا تصور۔ نقلِ لسان کے دو مراحل
باب نمبر۳ گجری ادب: گجرات	گجری ادب
باب نمبر۴ بہمنی دور	بہمنی دور کا ادب
باب نمبر۵ بیجاپور: عادل شاہی دور کا ادب	بیجاپور کا ادب، عادل شاہی دور
باب نمبر۶ گول کنڈہ: قطب شاہی دور کا ادب	گول کنڈہ کا ادب، قطب شاہی دور
باب نمبر۷ ولی: مرکز جو روایت کا ثمر۔ دکنی غزل کا نقطۂ عروج	ولی: مرکز جو روایت کا ثمر
باب نمبر۹ شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا، آغاز ولی کی کرامتِ سخن۔ ریختہ گو شعرا کا عہد	شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات
باب نمبر۱۰ ادبی روایت کا استحکام۔ عہد ساز شعرا کا دور	میر و سودا کا دور
باب نمبر۱۳ اُنّیسویں صدی میں اردو زبان کے دو ادارے	فورٹ ولیم کالج، سیاست، تاریخ اور اسلوب کی تشکیل
باب نمبر۱۵ مقامی رنگ اور عوامی روایت کا شاعر: نظیر اکبر آبادی	عوامی روایت کا شاعر، نظیر اکبر آبادی
باب نمبر۱۷ دلی میں کمپنی کی عمل داری، کمپنی کی سیاسی حکمتِ عملی اور مغلوں کے علامتی اقتدار کا خاتمہ	کمپنی کی عمل داری، کمپنی کی سیاسی حکمتِ عملی اور مغلوں کے علامتی اقتدار کا خاتمہ
باب نمبر۱۹ اردو مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر	مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر

یہ تو تھا فہرست میں ابواب کے عنوانوں اور متن کے عنوانوں کا فرق۔ اب ایک نظر ذیلی عنوانوں کو بھی دیکھتے چلیے۔ فہرست میں ابواب کے ذیل میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان سے معلوم نہیں پڑتا کہ یہ ابواب کی تفصیلات ہیں یا کہ ذیلی عنوان ہیں۔ مثلاً پہلے باب کو ہی لیجیے۔ اس میں باب کا کوئی عنوان نہیں مگر باب نمبر کے نیچے نفسِ مضمون کا خاکہ کھینچا ہے۔ متن میں بھی پہلے باب میں کوئی ذیلی عنوان نہیں ہے۔ جبکہ فہرست میں دوسرے باب کے ذیل میں شعرا کے جو نام دیے گئے ہیں وہ متن میں باب کے ذیلی عنوانات ہیں۔ اسی طرح فہرست میں تیسرے باب میں جو شعرا کے نام ہیں وہ متن کے ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ جبکہ فہرست میں چوتھے باب کے نیچے جو تفصیلات دی گئی ہیں ان میں سے کچھ نفسِ مضمون کے متعلق معلومات ہیں اور کچھ کو متن میں ذیلی عنوان بنایا گیا ہے۔ ساری کتاب میں تقریباً یہی صورتِ حال ہے۔ اس کے علاوہ فہرست میں دیے گئے ابواب کے ذیلی عنوانوں اور متن میں دیے گئے ذیلی عنوانوں میں بھی لفظوں اور ترتیب کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسے کہ فہرست میں باب نمبر۲ کا ایک ذیلی عنوان 'نوشہ گنج بخش' اور دوسرا 'افضل' ہے۔ متن میں یہ ''حضرت نوشہ گنج بخش اور 'گنج الاسرار'' اور ''افضل کی 'بکٹ

کہانی'' دیے گئے ہیں۔ باب نمبر ۵ میں عادل شاہی دور کے شعرا کو فہرستِ ابواب میں اس ترتیب سے ذیلی عنوان دیے گئے ہیں۔ برہان الدین جانمؔ، امین الدین اعلیٰؔ، عبدلؔ، شوقیؔ، شاہیؔ، نصرتیؔ، صنعتیؔ، مقیمیؔ۔ باب کے متن میں یہ ترتیب یوں ہے۔ برہان الدین جانمؔ، عبدلؔ، مقیمیؔ، صنعتیؔ، امین الدین اعلیٰؔ، حسن شوقیؔ، نصرتیؔ۔ اسی طرح آٹھویں باب کو الف، اور 'ب' دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ 'ب' فہرست میں جعفر زٹلیؔ کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ متن میں صفحہ ۲۴۳ پر اس باب میں حصہ 'ب' میں بھی تاریخ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ جعفر زٹلیؔ کو صفحہ ۲۵۲ پر نئے صفحے اور نئے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ابواب کے حواشی دینے کے لیے بھی یکساں طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ حواشی وحوالے عام طور پر پاورقی یا باب کے آخر میں یا کتاب کے خاتمے پر درج کیے جاتے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے کہ پہلے چھے ابواب کے حوالے تو ابواب کے آخر میں دیے ہیں لیکن اس کے بعد ساتویں باب میں جو ولیؔ دکنی اور سراجؔ اورنگ آبادی کے بیان میں ہے۔ ولیؔ دکنی کے بعد حوالے دے کر بظاہر تو باب کا خاتمہ کر دیا ہے مگر حوالے دینے کے بعد نئے صفحے سے سراجؔ کو جلی عنوان دے کر صفحہ ۲۲۹ تا صفحہ ۲۳۳ بیان کیا ہے۔ سراج کے ذکر میں کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۲۳۴ سے آٹھواں باب شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں بھی جو سیاسی تاریخ اور جعفر زٹلی کے بیان میں ہے۔ سیاسی تاریخ کے بعد صفحہ ۲۵۰۔۲۵۱ پر حوالے دے کر جعفر زٹلیؔ کو نئے صفحے اور جلی عنوان دے کر بیان کیا ہے اور اس کے حوالے الگ سے بیان کے آخر میں صفحہ ۲۵۸ پر دیے ہیں۔ نویں باب میں ایک اور منفرد طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ باب کے عنوان اور ذیلی عنوانوں کے مطابق باب کے آخر میں تین عنوان قائم کر کے حوالے دیے ہیں۔ یعنی نویں باب کا خاتمہ صفحہ ۲۸۵ پر ہوتا ہے۔ اب اسی صفحے پر ایک عنوان 'شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات' کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۲۸۶ پر ایک عنوان 'ابہام گو شعرا' کے تحت حوالے دیے گئے ہیں۔ پھر اسی صفحے پر تیسرا عنوان 'نئی شعریات کا ظہور' قائم کر کے حوالے دیے ہیں۔ واضح رہے کہ ان تینوں عنوانوں کے تحت ایک ہی باب کے حوالے دیے ہیں اور ہر عنوان میں حوالے کا نمبر نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔

ذیلی عنوانات کے سلسلے میں عدم احتیاط کی وجہ سے فہرست کے مقابلے میں کچھ عنوانات ابواب کے متن سے غائب ہیں مثلاً چوتھے باب میں فہرست میں نظامیؔ، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، مشتاقؔ، لطفیؔ، میراں جی شمس العشاق، فیروزؔ، اشرف بیابانی وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان میں نظامی، بندہ نواز، شمس العشاق، فیروز، اشرف بیابانی کو تو ذیلی عنوان دیے گئے ہیں مگر مشتاقؔ اور لطفیؔ کو کوئی عنوان نہیں دیا گیا جبکہ قاعدے کے مطابق انھیں بھی عنوان دینا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس فہرست میں گیارہویں باب کو کوئی ذیلی عنوان نہیں دیا گیا جبکہ متن میں اس کے تین ذیلی عنوانات، سیاست اور تاریخ، تہذیب، ادب بالترتیب قائم کیے ہیں۔

بعض ذیلی عنوانات کو نئے صفحے اور بڑی تقطیع کے جلی عنوان سے نئے باب کی طرح شروع کیا ہے۔ مثلاً سراجؔ کا ذکر ساتویں باب میں نئے صفحے اور بڑی تقطیع کے جلی حروف میں کیا ہے حال آں کہ یہ ذیلی عنوان ہے۔ یہی حال آٹھویں باب میں جعفر زٹلیؔ کا اور تیرھویں باب میں دلی کالج کا ہے جنھیں فہرست میں ابواب کی تقسیم کے مطابق ذیلی عنوان ہونا چاہیے۔ اس

کے علاوہ کتاب کے موضوعات کے بیان میں اعتدال کو بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا۔موضوعات افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ادبی تاریخ کی یہ کتاب سنہ ۱۰۰۰ صدی عیسویں سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔اس میں ۸۵۷ سالہ ادبی تاریخ کو پیش لفظ وغیرہ اور کتابیات واشاریے کے علاوہ حوالوں سمیت ۸۰۰ صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔ان ۸۰۰ صفحات میں مشاہیر میں سے ولؔی کو ۱۸ صفحات، میرؔ کو ۲۸، میر حسؔن کو ۲۰، مصحفؔی کو ۱۹، انشاؔء، جرأتؔ اور مضموؔن کو ۳۳، آتؔش و ناسؔخ کو ۳۰، دیاشنکر نسؔیم کو ۱۹، نظیؔر کو ۲۷، غالبؔ کو ۵۹، مومؔن کو ۱۹، ظفؔر کو ۱۸، شیفتؔہ کو ۱۳، سوؔدا کو ۱۹، دردؔ کو ۱۳، ذوقؔ کو ۱۱ جبکہ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے تجزیوں کو ۴۴ صفحات دیے گئے ہیں۔یہ کل صفحات ۴۸۰ بن جاتے ہیں۔اسی طرح سیاسی تاریخ کے آٹھویں باب کے ۱۷، گیارھویں کے ۳۹ اور سترھویں کے ۱۸ کل ۶۴ صفحات بنتے ہیں۔واضح رہے کہ سیاسی ماحول سے متعلق یہ ابواب الگ ہیں ورنہ جزیات تقریباً ہر باب میں کثرت سے موجود ہیں۔اگر ان ۶۴ صفحات کو ۴۸۰ صفحات میں شامل کیا جائے تو ۸۰۰ میں سے ۵۵۴ صفحات صرف چند مشاہیر اور سیاسی تاریخ پر صرف کیے گئے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی ۸۵۷ سالہ لسانی و ادبی تاریخ کو فورٹ ولیم کالج اور مرثیے سمیت ۲۳۶ صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔اس ادبی تاریخ کے خاکے میں وہ تمام عیوب بدرجہ اتم موجود ہیں جو کسی ناقص خاکے میں ہوسکتے ہیں۔خاکے پر نظر ڈالنے کے بعد اب ایک نظر اس کتاب کی تحقیقی نوعیت پر بھی ڈالتے چلیے۔

بعض مقامات پر حوالے مفقود ہیں۔مثلاً دوسرے باب میں بابا فرید کے ذکر میں کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔درمیان میں یہ لکھا ہے کہ ان مباحث کے لیے گیان چند کی تاریخ ادبِ اردو کی جلد اوّل سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔بابا فرید کی تاریخِ ولادت و وفات ذیلی عنوان کے نیچے صفحہ ۲۹ پر ۱۲۶۶ء۔۱۱۷۳ء بتائی ہے اس کے بعد متن میں بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ آپ کی تاریخِ پیدائش ۱۱۸۸ء۔۵۸۴ھ ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخِ ادب میں سالِ ولادت ۱۱۷۳ء تسلیم کیا ہے جس کے مطابق ہجری سنہ ۵۶۹ھ ہے نہ کہ ۵۸۴ھ۔جالبی نے بابا فرید کا سالِ وفات ۱۲۶۵ء مطابق ۶۶۴ھ بتایا ہے۔[٦] چوتھے باب میں صفحہ ۹۹ پر اشرف بیابانی کا ذکر بغیر حوالے کے کیا ہے۔پانچویں باب میں صنعتؔی کا ذکر صفحہ ۱۱۶ تا ۱۱۸ بغیر کسی حوالے کے ہے۔چھٹے باب میں محمود کا ذکر صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۳ بغیر حوالے کے ہے۔اسی باب میں ابنِ نشاطی کا بیان صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۱ بغیر کسی حوالے کے ہے۔ساتویں باب میں سراج اورنگ آبادی کے ذکر از صفحہ ۲۲۹ تا ۲۳۳ میں کہیں کوئی حوالہ نہیں ہے۔کئی مقامات پر بعض ادبی حقائق اور بحثوں کے پیراگراف کے پیراگراف بغیر حوالے کے لکھ جاتے ہیں۔یہاں صرف ایک مثال درج کی جاتی ہے۔دسویں باب میں سوؔدا کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> دلی کے اسی سیاسی و ادبی ماحول میں مرزا رفیع سوؔدا ۱۷۰۶/۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب اپنے نصف النہار پر پہنچ کر احمد آباد میں شاہ برہان الدین غریبؔ کے احاطہ میں غروب ہو چکا تھا۔۔۔الخ۔''[٧]

یہ پیرگراف ساڑھے تیرہ سطور پر مشتمل ہے مگر اس پر کوئی حوالہ نہیں۔اس کے بعد دوسرا پیراگراف جو کہ ساڑھے آٹھ سطور کا ہے۔اس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

> سوؔدا نے ۳۸۔۱۷۲۸ء/۵۰۔۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ مشقِ سخن کا آغاز کیا اور شاہ حاتؔم کی شاگردی اختیار کی

۔یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں مراختوں کا دور چل رہا تھا۔سوداؔ فارسی کیجانب مائل تھے۔۔۔الخ۔''۸

لیکن حوالہ کوئی نہیں ہے۔یہ صورتِ حال اکثر مقامات پر ہے۔شعرا کے سنینِ ولادت وفات کے سلسلے میں بھی عدم احتیاطی نظر آتی ہے۔کہیں تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مذکورہ سنہ شاعر کا سنہ پیدائش ہے یا سنہ وفات ہے۔مثلاً صفحہ ۶۰ پر جو سنہ ۱۵۳۴ع/۹۴۱ھ قاضی محمودؔ ریائی کی ذیلی سرخی کے نیچے دیا ہے اس پر وفات یا پیدائش کی نشاندہی نہیں کی گئی۔چوں کہ متن میں بھی اس پر کوئی بحث نہیں ہے اس لیے یہ قاری کی اپنی صوابدید پر ہے کہ وہ اسے سالِ پیدائش سمجھے یا وفات۔شعرا کی ولادت اور وفات کے متعلق اکثر حوالے نہیں ملتے کہ کہاں سے اخذ کی گئی ہیں حال آں کہ بعض شعرا کی پیدائش اور وفات کی تواریخ اختلافی ہیں اس لیے جب کوئی تاریخ درج کی جائے تو حوالہ لازمی دینا چاہیے۔سوداؔ ہی کی مثال لے لیجیے۔سوداؔ کی تاریخِ ولادت کے سلسلے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق کر کے ۱۱۸۸ھ کو درست سالِ ولادت قرار دیا ہے۔۹ تبسم کاشمیری نے بھی صفحہ ۲۹۱ پر ۱۱۸۸ھ کے لگ بھگ لکھا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا۔اسی طرح صفحہ ۳۵ پر کبیرؔ کی سرخی کے نیچے سالِ پیدائش ۱۴۷۰ع۔۱۴۴۰ کے درمیان جانے کہاں سے لیا ہے۔جبکہ متن میں لکھتے ہیں کہ:

> کبیرؔ کے دو بڑے محققوں پنڈت چتر ویدی اور ڈاکٹر واڈی وائل (Dr.vaudivile) کے بقول کبیرؔ کا یقینی سالِ پیدائش بتانا ممکن نہیں مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ ۱۳۹۸ع میں پیدا ہوا اور ۱۴۴۸ع میں وفات پا گیا۔''۱۰

جب کبیرؔ کے دو بڑے محققوں نے پیدائش اور وفات کے سال اپنی تحقیق کے مطابق مقرر کر دیے ہیں تو ابتدا میں جلی حروف میں (پیدائش ۱۴۷۰ع۔۱۴۴۰ع) کس محقق کی تحقیق کے مطابق لکھی گئی ہے اور چتر ویدی اور واڈی وائل کی مقررہ تاریخوں کو رد کرنے کی کیا وجہ ہے۔؟ یہ بتانا چاہیے تھا۔بعض شعرا کا سالِ ولادت معلوم ہو سکنے کے باوجود صرف سالِ وفات دیا ہے اور وہ بھی بغیر حوالے کے۔مثلاً صفحہ ۴۱ پر حضرت نوشہ گنج بخش کی وفات کا سال ۱۶۵۴ع بغیر حوالے کے دیا ہے جبکہ ولادت کے سال سے صرفِ نظر کیا ہے۔حال آں کہ نوشہ گنج بخش کے سلسلے میں جالبی کی تاریخ ان کے سامنے تھی اور انھوں نے صفحہ ۴۲ پر گنج الاسرار کے متعلق جالبی کا حوالہ بھی دیا ہے۔جالبی نے گنج بخش کی تاریخِ ولادت و وفات ۹۵۹ھ۔۱۰۶۴ھ بہ مطابق ۱۵۵۱ع۔۱۶۵۳ع تحریر کی ہیں۔۱۱ کاشمیری نے سنین بھی اکثر عیسوی دیے ہیں اور جہاں کہیں ھجری سن دیے ہیں وہاں بھی ان کے بالمقابل ایک عیسوی سن دیا ہے۔جبکہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اگر ہجری سنہ کا مہینہ اور تاریخ معلوم نہ ہوں تو اس کے ساتھ دو عیسوی سنہ دینے چاہییں۔

تبسم کاشمیری کلاسیکی ادب کی کتابوں کے نام بھی اپنی مرضی سے درج کر دیتے ہیں۔صفحہ ۹۳ پر میراں جی شمس العشاق کی ایک مثنوی کا نام 'شہادت الحقیقت' لکھا ہے۔اس نام کی شمس العشاق کی کوئی مثنوی نہیں ہے۔جمیل جالبی نے اس کا نام 'شہادت التحقیق' درج کیا ہے۔۱۲ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کا نام 'شہادت الحقیق' ہے۔اور اس مثنوی کے درج ذیل شعر سے یہ نام ثابت ہے۔

اس نام ہے تحقیق　　سن شہادت الحقیق

اگرچہ 'حقیق' کوئی مسلمہ لفظ نہیں ہے، مگر جب شاعر نے خود اسے یہی نام دیا ہے تو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔[۱۳] اسی طرح اشعار میں باندھے گئے ناموں کی بنا پر بغیر کسی تاریخی دستاویز کے نتائج قیاس کر لیتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۸۱ پر ''قدرم راؤ پدم راؤ' کے مصنف نظامی کے نام فخر دین سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چوں کہ اس قسم کے نام پنجاب میں رکھے جاتے ہیں اس لیے ان کے خاندان کا تعلق کسی نہ کسی صورت پنجاب سے تھا۔ حال آں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ نام 'فخر الدین' ہو جسے ضرورتِ شعری کے تحت 'فخر دین' باندھ لیا گیا ہو۔[۱۴] ابواللیث صدیقی نے اپنی 'تاریخ زبان و ادب اردو' میں نظامی کا نام 'فخر الدین' لکھا ہے۔[۱۵] کاشمیری ادبی تجزیوں میں بھی مصنفین اور شعرا کی کتب سے براہ راست استفادے کی بجائے ثانوی ماخذ پر انحصار کرتے ہیں۔ مثلاً قلی قطب شاہ کے ذکر میں ڈاکٹر زورؔ کی مرتب کردہ 'کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ' کا حوالہ دے کر قلی قطبؔ شاہ کی پیاریوں کا سراپا دکھانے کے لیے اشعار کے نثری ترجمے دیے ہیں۔ اسی طرح بعض ضروری مقامات پر تصانیف کے نمونے دینے میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔ جیسے کہ صفحہ ۹۹ پر اشرف بیابانی کی تصنیف 'نوسرہار' کا تذکرہ ہے اور کاشمیری اسے بہمنی دور کے آخری سالوں کا لسانی اور شعری تجربہ قرار دیتے ہیں مگر اس تصنیف سے کوئی مثال نہیں دیتے۔ سوداؔ کے بیان میں ان کی ہجویات کا ذکر کیا ہے مگر کوئی مثال نہیں دی۔

مرثیے کے پورے باب میں انیسؔ و دبیر کے مرثیوں کا ایک بند بھی نہیں دیا۔ حیرت اس وقت اور بڑھی جب کتابیات کو دیکھا گیا تو کسی مرثیہ گو کی کلیات کا نام نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کاشمیری نے مرثیوں کی صرف تنقید ہی پڑھی ہے۔ کوئی مرثیہ ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے برعکس انھیں تصانیف کے خلاصے دینے میں مہارت حاصل ہے۔ مثلاً پانچویں باب ''بیجاپور کا ادب' میں صفحہ ۱۰۵ پر عادل شاہ ثانی کی کتاب 'نورس' سے نمونہ کلام پیش کرنے کی بجائے۔ کتاب کے متعلق ڈاکٹر نظیر احمد کے عالمانہ تعارف کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ صفحہ ۱۱۶ پر 'قصہ بے نظیر' کے خالق صنعتیؔ کا ذکر کیا ہے اور اس کی مثنوی کا خلاصہ اڑھائی صفحات میں پیش کیا ہے۔ کاش اس کی بجائے انھوں نے 'قصۂ بے نظیر' کے دو چار اشعار ہی دے دیے ہوتے۔ وہ بعض ادبی حقائق سے بھی لاعلم معلوم ہوتے ہیں۔ صنعتی کی انھوں نے ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے مگر نصیر الدین ہاشمی نے صنعتیؔ کی ایک اور مثنوی 'گل دستہ' کا ذکر بھی کیا ہے۔[۱۶] صفحہ ۱۰۷ پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ ''تاج الحقائق'' کو وجہی سے منسوب کیا گیا ہے مگر جالبی اسے وجیہ الدین محمد کی تصنیف بتاتے ہیں۔ کاشمیری کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر انور سعید نے اپنی مرتبہ ''تاج الحقائق'' میں جو کہ بمبئی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی دلائل سے اسے وجہی کی تصنیف ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شوپرشاد جاوید شسٹ بھی اسے وجہی کی تصنیف مانتے ہیں۔[۱۷]

بنیادی ماخذ سے براہِ راست استفادہ نہ کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسروں کے تجزیوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کاشمیری نے صفحہ ۱۲۲ پر لکھا ہے کہ ''خود بادشاہ کی کتاب 'نورس' سے اردو کی روایت شروع ہوتی ہے۔' انھوں نے شاید 'نورس' نہیں دیکھی اس لیے نمونہ کلام بھی نہیں دیا۔ گیان چند نے 'نورس' سے بھیروں راگ کے کچھ اشعار دیے ہیں نمونہ یہ ہے۔

کیا اس زبان کو اردو کہا جا سکتا ہے۔۱۸؎ کاشمیری یقیناً لسانیات کے آدمی بھی نہیں ہیں اس وجہ سے انھوں نے تاریخِ زبان سے متعلق باب پر بھی خاص توجہ نہیں دی۔لسانیات کے متعلق ان کی معلومات سنیتی کمار چٹرجی، محمود شیرانی، عبدالقادر سروری اور زور تک محدود ہیں۔انھی کی کتب کے حوالے کاشمیری نے اس باب میں دیے ہیں۔اردو کے ماخذ کے بارے میں ان کے بیانات خاصے الجھے ہوئے ہیں۔فرماتے ہیں:

> ''غزنوی عہد کے پنجاب کی زبان لاہوری (پنجابی) تھی جو پورے علاقے کا ذریعۂ اظہار تھی۔اس زبان پر ایرانی فتوحات اور حملوں کے بعد لسانی اثرات مزید بڑھنے لگے تھے اور جب ۱۰۲۱ء میں غزنوی دور میں لاہور مرکز قرار پایا تو یہ اثرات مزید گہرے ہوتے ہوئے ایک نیا لسانی عمل ظاہر کرنے لگے۔ترکی، عربی، فارسی، پنجابی اور مقامی اپ بھرنش کے باہمی ملاپ سے زبان کا ایک ایسا اسلوب تیار ہونے لگا جو مقامی آبادی اور نئے آبادکاروں کے لیے نیا ذریعۂ اظہار بنتا گیا۔''۱۹؎

لسانیات کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ ایک نئی زبان کسی ایک ہی قدیم زبان سے ارتقاء پاتی ہے، کئی زبانیں مل کر ایک زبان پیدا نہیں ہوتی۔اس لیے یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ اردو نے کسی ایک ہی زبان سے ارتقاء پایا ہے، جو کہ پنجابی یقیناً نہیں ہے۔کاشمیری بھی دراصل بہت سے لوگوں کی طرح اس غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں کہ شیرانی نے اردو کے پنجابی سے ماخوذ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی تاریخ زبان و ادب میں اردو کے پنجابی سے ماخوذ ہونے کے نظریے سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ جارج گریرسن نے اپنی کتاب ''جائزہ لسانیہ ہند'' میں پنجابی کو اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے جس کا ایک اقتباس حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں تحریر کر دیا جس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو پنجابی سے نکلی یا اس کی ترقی یافتہ شکل ہے حال آں کہ اس کا دعویٰ نہ گریرسن نے کیا ہے اور نہ ہی شیرانی نے۔۲۰؎ مقامی اپ بھرنش سے کشمیری کی مراد جانے کون سی اپ بھرنش ہے۔۱۰۰۰ء کے لگ بھگ جس اپ بھرنش کا حلقۂ اثر سب سے زیادہ وسیع تھا وہ شورسینی اپ بھرنش تھی۔اس کا حلقۂ اثر پنجاب راجپوتانہ و گجرات کے ذریعے سندھ و ملتان میں بھی پھیلا ہوا تھا۔برج بھاشا، اودھی، پنجابی اور ہندی وغیرہ اسی اپ بھرنش کی شاخیں ہیں۔۲۱؎ اردو کا ماخذ بھی پنجابی کی طرح یہی شورسینی اپ بھرنش ہے، جو پہلے کھڑی بولی کی صورت میں ارتقا کی منازل تک پہنچی، اور پھر یہ کھڑی بولی نکھر کر اردو کے روپ میں ظاہر ہوئی۔تبسم کاشمیری نے صفحہ ۲۱ پر زور کی 'ہندوستانی لسانیات' سے ایک اقتباس دیا ہے۔اس کی چند سطور یہ ہیں:

> ''اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسویں میں بولی جاتی تھی۔مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔''

اس بیان سے کاشمیری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ زورؔ کے خیال میں اردو کی بنیاد پنجابی اور مغربی اپ بھرنش دونوں پر ہے اور اس کے فوراً بعد صفحہ ۲۲ پر رقم طراز ہیں کہ :

''سنیتی کمار چٹرجی کے نظریے میں ڈاکٹر زورؔ کی مطابقت ملتی ہے۔ وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ ۱۱۹۳ع میں فتح دلی کے بعد جس نئی بولی کا سلسلہ شروع ہوا اس کی بنیاد پنجابی اور مغربی اتر پردیش کی مغربی اپ بھرنش پر تھی۔''

لیکن زورؔ کے اس بیان پر ان کی نظر شاید نہیں پڑی کہ :

''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں۔ اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔'' ۲۲

اگرچہ اب زورؔ کے اس بیان کی بھی کوئی اہمیت نہیں کیوں کہ محققینِ لسانیات اب اس بات کو عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کھڑی بولی ہی کا جدید روپ ہے۔ ۲۳

کوئی محقق جب ادبی تاریخ لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ دستیاب ادبی حقائق کی جانچ پڑتال کر کے ان کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یا نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس ادبی تاریخ کا یہ پہلو بھی خاصا کمزور ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے زیرِ نظر گیان چند، سیدہ جعفر اور جمیل جالبی کی اہم ادبی تاریخی رہی ہیں لیکن تبسم کاشمیری نے صرف انھی کے مہیا کردہ حقائق کو جوں کا توں بیان کیا ہے اور کوئی ایسی معلومات فراہم نہیں کیں جنھیں نئی تحقیق کہا جا سکے۔ اس کے برعکس انھوں نے بعض ادبی حقائق کے سلسلے میں شکوک و شبہات کو بڑھایا ہے۔ مثلاً صفحہ ۴۲، ۴۳ پر نوشہ گنج سے منسوب 'گنج الاسرار' کے اشعار کے متعلق خورشید احمد خان کی تحقیق کا ذکر کر کے اور ان سے غلط طور پر منسوب کلام کا نمونہ دے کر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اس کلام کی زبان اٹھارویں یا انیسویں صدی کی ہو سکتی ہے عہدِ جہاں گیر کی نہیں۔ مگر اس کے بعد یہ لکھتے ہیں کہ :

''حضرت نوشہ گنج سے منسوب اردو کلام کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے میں نے اوساکا سے اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ جس کے جواب میں ازراہِ نوازش انھوں نے ایک مفصل مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خورشید احمد خان کی تحقیق کو رد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خورشید احمد خان ایک کم استعداد، ناقص معلومات رکھنے والے اور تحقیقی بصیرت سے عاری شخص تھے۔ جبکہ ڈاکٹر گیان چند نے خورشید احمد خان کے کام کو اردو تحقیق کی تاریخ کا ایک زریں باب قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس بات کو لاشعوری طور پر البتہ قبول بھی کرتے ہیں کہ 'گنج الاسرار' کے دس اشعار ایسے ہیں جن کا انتساب حضرت نوشہ گنج بخش کے علاوہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نوشہ صاحب نے دس شعر بھی کہے ہوں تو 'گنج الاسرار' کو جعلی نہیں کہا جا سکتا۔'' ۲۴

تبسم کاشمیری نے جو اشعار نوشہ بخش سے منسوب کلام کے پیش کیے ہیں۔ان کا نمونہ یہ ہے۔

جو آویں بندیوں کے کام　　دیں دنیا میں ہوویں تمام
سب قرآن مجید میں آئے　　حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

انھیں لسانی ساخت کے اعتبار سے نوشہ گنج کی تخلیق قرار دیا جانا اندھیر ہوگا۔اس لحاظ سے خورشید احمد خان کی تحقیق سو فی صد درست ہے۔کاشمیری کو چاہیے تھا کہ اگر انھوں نے گوہر نوشاہی صاحب سے اپنی خط و کتابت کو اس تاریخ کا موضوع بنایا ہے تو ان اشعار کی جگہ وہ دس اشعار دیتے جو بقول گوہر نوشاہی گنج بخش کے علاوہ کسی دوسرے سے منسوب نہیں کیے جا سکتے تا کہ قاری کوئی رائے قائم کر سکے خالی خولی باتیں بغیر ثبوت کے درج کرنے کا کیا فائدہ ہے۔غرض کہ ادبی تحقیق کے سلسلے میں اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے نیا کہا جا سکے۔تحقیق کے بعد اب آیئے تجزیاتی اور تنقیدی وژن کی طرف۔

کئی جگہ اصل تخلیقات سے براہِ راست استفادے کی بجائے ثانوی مآخذ سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔تنقید کا انداز بھی کچھ ایسا ہے کہ انشا کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔''کیا انشاؔ کو معلوم نہ تھا کہ تغزل کیا چیز ہے؟ اور 'جوڑے' یا 'پتھر' کا تغزل سے کوئی ادنیٰ سا تعلق بھی ہے یا نہیں۔''۲۵ کاشمیری کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تغزل کا تعلق لفظوں سے نہیں لفظوں کے برتنے سے ہے۔اور نہ ہی جوڑے یا پتھر کے ردیفوں سے تغزل کا تعلق ہے۔راقم الحروف نے خود بھی 'پتھر' کے ردیف میں ایک غزل کہی ہے۔ایک شعر درج ذیل ہے۔

؎ اس نے باتوں میں بھی کچھ زخم لگائے گہرے　　گفتگو کی بھی تو لفظوں میں اچھالے پتھر

کاشمیری صاحب کی اس تنقید سے پہلے میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس غزل میں تغزل کی شان میں کوئی حرج واقع نہیں ہوا۔انشاؔ کے انھوں نے صرف وہ اشعار دیے ہیں جن کا تعلق خارجی پہلو سے ہے۔جبکہ انشاؔ کے ہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں۔

؎ نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

حال آں کہ انھوں نے انشاؔ کے تغزل پر تنقید کرتے ہوئے ''آبِ حیات'' کے حوالے دیے ہیں مگر انھیں ''آبِ حیات'' میں ایسے شعر نظر نہیں آئے۔صفحہ ۴۵۰ پر درج ہے کہ انشاؔ معنویت کی دُنیا کا شاعر نہیں،اس کے بعد صفحہ ۴۵۱ پر لکھتے ہیں کہ انشاؔ نے غزل کے معنوی انتشار کی جگہ معنوی وحدت کو فروغ دیا۔یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک ایسا شاعر جو معنویت کی دنیا کا نہیں ہے معنوی وحدت کو فروغ کیسے دے سکتا ہے۔؟صفحہ ۳۸۳ پر درج کیا گیا ہے کہ لکھنؤ کی ابتدائی تہذیب دلی کی طرح تھی۔فرماتے ہیں:

> ''لکھنؤ میں تہذیب و ثقافت کی جو نشو و نما اودھ کے اس دور میں ہوئی۔اس میں گراں قدر حصہ اہلِ دلی کا تھا۔یہاں کی تہذیب کا پودا دلی ہی سے گیا تھا۔اس لحاظ سے لکھنؤ کے دبستان کو دلی ہی کی توسیعی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔اس دبستان کی تشکیل میں بنیادی کردار ان ہی شعرا کا تھا جو بہ ذاتِ خود ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچے تھے یا پھر ان کی نئی نسلوں نے اس کو ترقی دی تھی۔''

کسی مقام کی تہذیب وثقافت میں وہاں کے معاشی، سیاسی اور مذہبی عقائد کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ کاشمیری صاحب کی فہرستِ کتابیات میں ابواللیث صدیقی کی ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' بھی شامل ہے۔ اس تحقیقی کتاب کے آغاز ہی میں لیث صاحب نے ان سیاسی، معاشی اور مذہبی عناصر کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے لکھنؤ کی تہذیبی فضا کو جنم دیا جو اپنی ابتدا یعنی نواب اودھ امین الدین کے عہد سے ہی دلی سے ممتاز تھی۔ ۲۷ لکھنؤ ہجرت کرنے والے شعرا انشاؔ، جرأتؔ وغیرہ اس تہذیب سے متاثر ہوئے نہ کہ انھوں نے اس کے بنانے میں حصہ لیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی سے لکھنؤ ہجرت کرنے والے شعرا کی زبان نے ابتدا میں لکھنؤ کو متاثر کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں تشیّع کے فروغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''حسینؑ کی ذات کی اعلیٰ ترین صفات کی نفی اس تہذیب کا ایک تضاد بن گیا تھا۔ نوحہ گری اور ماتم پرستی کی روایت نے اس تہذیب کے اندر خود اذیتی کو پیدا کیا اور اس تہذیب کے پیروکاروں میں ایک مجہول انفعالیت کو فروغ ملا۔'' ۲۸

کاشمیری کا یہ بیان بذاتِ خود مجہول اور غیر ذمہ دارانہ نوعیت کا ہے۔ کیوں کہ لکھنوی تہذیب میں خود اذیتی کا نہیں بلکہ عیش کوشی کا رجحان غالب تھا، جس کا سبب معاشی فارغ البالی بنی۔ حسین کی نوحہ گری اور ماتم پرستی کی روایت اگر خود اذیتی اور مجہول انفعالیت کو جنم دیتی تو ایران جو اس روایت کا سب سے بڑا علم بردار ہے صفحۂ ہستی سے لکھنوی تہذیب کی طرح مٹ گیا ہوتا۔ افسوس یہ بات تاریخ کے ایک ایسے مقام پر کہی گئی ہے جہاں سالوں پہلے نوحہ گر اور ماتم پرست ایران انقلاب کے ذریعے پوری دنیا پر اپنی فعالیت کی دھاک بٹھا چکا ہے اور حزب اللہ یہودیوں کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے۔ ایک ادبی مورخ کو ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے گریز کرنا چاہیے۔ کاشمیری نہیں جانتے کہ لکھنؤ میں بگڑی ہوئی تہذیب کی اصلاح کا بیڑہ مذہب ہی نے اٹھایا۔ مرثیہ جو رونے رلانے کے لیے لکھا جاتا ہے لکھنوی تہذیب کے لیے مصلح ثابت ہوا۔ ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مصنوعی رنگ اور پست جذبات نے جو لکھنوی شاعری میں راہ پا گئے تھے۔ لکھنؤ کی سوسائٹی اور مذاق کو پایۂ ثقاہت سے گرا دیا، لیکن مرثیہ نگاری نے اس کا بدل کر دیا۔'' ۲۹

کاشمیری کا مذہب وعقیدہ معلوم نہیں کیا ہے۔ مگر ایک ادبی مورخ سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والی مقدس شخصیات کے ذکر میں تعظیمی الفاظ و القاب کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ کاشمیری نے جہاں بھی آئمہؑ اثنا عشری کا ذکر کیا ہے، وہاں کوئی تعظیمی سابقہ یا لاحقہ استعمال نہیں کیا۔ امام حسینؑ کے ساتھ بھی کہیں امام یا حضرت کا لفظ نہیں صرف حسین لکھا ہے۔ حتیٰ کہ تعظیمی نشانات '' رح'' یا ''رض'' تک موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہ کتابت کا سہو ہو مگر یہ سہو ساری کتاب میں موجود ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بزرگانِ دین کے ناموں کے ساتھ حضرت یا امام کے تعظیمی الفاظ ہی لگائے جائیں۔ اس کتاب کی اب تک کی بحث سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

(i) تاریخی حقائق کی چھان بین پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

(ii) کئی کئی صفحات پر حوالے نظر نہیں آتے۔

(iii) شعرا کے ذکر اور تصانیف کے تجزیوں میں اعتدال سے کام نہیں لیا گیا۔ صرف چند مشاہیر پر تمام توجہ صرف کی

ہے۔

(iv) خاکے میں کوئی منصوبہ بندی نظر نہیں آتی۔اسی وجہ سے نہ ابواب کا درست تعین کیا جاسکتا ہے نہ ذیلی عنوانوں کا۔

(v) حواشی دینے کا کوئی ایک طریقہ ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا جہاں جی چاہا باب کے اندر یا باہر حواشی دے دیے ہیں۔

(vi) تاریخ کی چھوٹی سے چھوٹی جزیات کو بھی جو کہ ضروری نہیں جا بجا بیان کیا ہے اور پھر تاریخ وسیاست کے الگ باب بھی بنائے گئے ہیں۔

(vii) بعض ضروری مواقع پر تخلیقات کے نمونے موجود ہونے چاہییں تھے جو کہ نہیں دیے گئے۔

(viii) یہ کتاب دکنی ادب تک تو تاریخِ ادب نظر آتی ہے مگر اس کے بعد صرف تجزیوں کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔

(ix) اس تاریخ کو پڑھ کر آخر تک معلوم نہیں ہوتا کہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کون ہے اور اردو نثر کی پہلی کتاب کونسی ہے اور کس نے لکھی؟

(x) ہجری سنین کے با المقابل صرف ایک عیسوی سنہ دیا ہے جبکہ احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہجری سال کا مہینہ اور تاریخ معلوم نہ ہونے کی صورت میں دو عیسوی سنہ دیے جائیں۔

تبسم کاشمیری نے سارا زور تجزیہ نگاری پر صرف کیا ہے۔لیکن کیا کوئی کتاب صرف تجزیہ نگاری کی بدولت تاریخ ادب بن سکتی ہے۔اس بارے میں گیان چند اسپلر کے حوالے سے کہتے ہیں:

> اسپلر نے سب سے اہم بات یہ کہی ہے کہ ادبی مورخ کو نظریے اور تنقیدی تجزیے کا کام دوسروں پر چھوڑنا ہوگا۔۔۔ان اردو والوں کو اس نکتے پر خاص توجہ کرنی چاہیے جو ادبی تاریخ کو ادبی تنقید کے مترادف بنا دیتے ہیں۔''[۳۰]

تاہم اس کتاب میں درج ذیل خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

(i) اس تاریخِ ادب کو دیدہ زیب سرِ ورق کے ساتھ مضبوط جلد میں نفاست سے شائع کیا گیا ہے۔

(ii) گرد پوش پر کتاب کے نام ،مصنف اور پبلشر کے متعلق معلومات دی گئی ہیں تاکہ الماری میں رکھی ہونے کی صورت میں شناخت میں آسانی ہو سکے۔

(iii) کتاب کو جا بجا تصاویر سے آراستہ کیا گیا ہے۔نقشے بھی دیے ہیں تاکہ اس دور کی جغرافیائی حدود کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

(iv) ادبی کتب کے جائزوں میں اگرچہ کوئی نئی بات نہیں مگر ادب کے عام قاری کے لیے فائدے مند ہو سکتے ہیں۔

(v) کتاب کے خاتمے پر دکن کی بہمنی سلطنت ،مغلیہ،اودھ بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کی ریاستوں کے حکمرانوں کے نام دورِ حکومت کے سنین کے ساتھ یادداشت کے لیے درج کیے گئے ہیں۔

(vi) آخر میں مقامات، کتب، اسماً وادارہ جات کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے جس سے آجکل عام طور پر صرفِ نظر کیا جاتا ہے،مگر افادیت کے لحاظ سے اہم ہے۔

کاشمیری کی اس ادبی تاریخ کے اس مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کتاب میں خوبیوں کے مقابلے میں خامیاں زیادہ ہیں۔اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کاشمیری ادبی مورخین کی فہرست میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکے۔ پشت کتاب پر لکھی گئی تعارفی تحریر میں بتایا گیا ہے کہ کاشمیری اس کتاب کی دوسری جلد کی تکمیل میں مصروف ہیں، اب تک یہ جلد منظرِ عام پر نہیں آئی۔امید یہی ہے کہ اگر یہ کتاب کبھی شائع تو اس میں یہ خامیاں نہیں ہوں گی جو پہلی جلد میں موجود ہیں۔

حواشی

۱۔کاشمیری،ص:۔۱۵ ۲۔ایضاً،ص:۔۱۲۔۱۳ ۳۔ایضاً،ص:۔۱۴

۴۔ایضاً،ص:۔۹۔۱۰ ۵۔ایضاً،ص:۔۱۵ ۶۔جالبی،جلداوّل،ص۳۶

۷۔کاشمیری،ص:۔۲۹۱ ۸۔ایضاً ۹۔جالبی،جلددوم،ص:۔۶۵۴

۱۰۔کاشمیری،ص:۔۳۵ ۱۱۔جالبی،جلداول،ص:۔۶۲۶ ۱۲ایضاً،ص:۔۱۶۸

۱۳۔گیان چند،اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۔۱۰۷

۱۴۔ایضاً،ص:۔۷۰۶ ۱۵۔صدیقی،تاریخ زبان وادبِ اردو،ص:۔۱۷۳

۱۶۔گیان چند،اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۔۷۰۵ ۱۷۔ایضاً،ص:۔۷۰۶

۱۸۔ایضاً،ص:۔۷۰۳ ۱۹۔کاشمیری،ص:۔۲۰ ۲۰۔صدیقی،تاریخِ زبان وادبِ اردو،ص:۔۵۳

۲۱۔جالبی،جلداوّل،ص:۔۷ ۲۲۔زور،ص:۔۱۱۵۔۱۱۶ ۲۳۔عبدالودود،ص:۔۳۳

۲۴۔کاشمیری،ص:۔۴۳ ۲۵۔ایضاً،ص:۔۴۴۶ ۲۶۔ایضاً،ص:۔۳۸۳

۲۷۔صدیقی،لکھنؤ کا دبستانِ شاعری،ص:۔۳۴۔۴۶ ۲۸۔کاشمیری،ص:۔۴۸۵

۲۹۔صدیقی،لکھنؤ کا دبستانِ شاعری،ص:۔۸۹ ۳۰۔گیان چند،تحقیق کا فن،ص:۔۳۶۳

کتابیات

۱۔جالبی،جمیل،ڈاکٹر،ستمبر/۲۰۰۸ء ' تاریخِ ادبِ اردو'،جلد،اوّل،لاہور:مجلسِ ترقی ادب

۲۔ایضاً،اپریل/۲۰۰۹،جلددوم ۳۔جین،گیان چند،ڈاکٹر،۲۰۰۰ء،'اردو کی ادبی تاریخیں' کراچی:انجمنِ ترقی اردو

۴۔ایضاً،۲۰۰۳ء،'تحقیق کا فن' اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان پاکستان

۵۔زور،محی الدین،قادری،ڈاکٹر،۱۹۶۱ء،'ہندوستانی لسانیات' لاہور:مکتبہ معین الادب

۶۔صدیقی،ابواللیث ڈاکٹر،۱۹۹۸ء،'تاریخِ زبان وادبِ اردو' کراچی:رہبر پبلشرز،اردو بازار

۷۔ایضاً،۱۹۸۷ء،'لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' کراچی:غضنفر اکیڈمی پاکستان

۸۔عبدالودود،ڈاکٹر،۱۹۸۴ء،'اردو سے ہندی تک' کراچی:مجلسِ فکر وادب

۹۔کاشمیری،تبسم،۲۰۰۳ء،'اردو ادب کی تاریخ،ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک' لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز